بحث ونظر: حضرت مولانا یحییٰ نعمانی
خصوصی مضمون برائے ''الحق'' صدر المعہد العالی للدراسات الاسلامیہ لکھنؤ

علت القتال کیا ہے؟ کفر؟ شوکت کفر؟ یا محاربہ؟
جہاد کی آیات اور ان کے پس منظر کی روشنی میں

تمہید وخلاصہ:

اس مضمون میں قرآن وسنت وسیرت نبوی کی بنیاد پر یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ ('فتنہ' اور ظلم کے علاوہ) محاربہ علت القتال ہے۔ اسلام نے (بشرط قدرت) دفاعی جنگ کا بھی حکم دیا ہے اور اقدامی کا بھی۔ لیکن بامعنیٰ صلح کی خواہش مند غیر مسلم ریاست سے جنگ کی اجازت نہیں ہے۔ مقالہ نگار کے نزدیک جہاد کی یہ تعبیر وتشریح کہ مسلمانوں کو مشرق ومغرب کے ہر کالے اور گورے غیر مسلم ملک پر، چاہے وہ جنگجو ہو یا صلح جو، جنگ کرنے کا حکم ہے، اسلام دشمن لابیوں کی خدمت انجام دینا ہے کہ وہ ساری دنیا کو مسلمانوں کی دشمنی پر متحد کریں۔

مقالہ کا ایک خاص محرک حالات کا ایک نیا لیکن فوری تقاضہ بھی ہے جس کی وضاحت مقالے کے بالکل آخر میں کی گئی ہے۔ اجمالاً وہ ضرورت یہ ہے کہ ہم اب ایک ایسے دور کی دہلیز پر ہیں جس میں دنیا کی قیادت مغرب سے مشرق کی نئی قوموں کو منتقل ہو رہی ہے۔ مستقبل میں یقیناً بین الاقوامی پالیسیوں کا محور نئے مسائل ومصالح اور نئے افکار ہوں گے۔ لہٰذا فوری ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے بارے میں ''خطرہ'' کے اس تأثر کو ختم کرنے کی کوشش کریں جو اس وقت موجود ہے اور مسلم دشمن لابیز کے نہایت کام کی چیز ہے۔

اسلامی جہاد کے بارے میں سب سے بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا اس کا مطلب مسلمانوں کو ہر غیر مسلم حکومت سے جنگ کی تعلیم وترغیب ہے؟ یعنی کیا مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر ان کے لئے ممکن ہو تو وہ ضرور غیر مسلموں سے جنگ کریں۔ اصولی طور پر سوال یہ ہے کہ کیا ظلم وجارحیت اور ''فتنہ'' یعنی مذہبی جبر کے خاتمہ کے علاوہ ''کفر'' علۃ القتال ہوسکتا ہے؟؟ یا اگر کفر نہیں تو کیا صرف غیر مسلم حکومت کے وجود کو جنگ کیلئے کافی جواز اور سبب قرار دیا جاسکتا ہے؟۔

ہمارے محدود مطالعے کی حد تک قدیم علمی وفقہی سرمایے میں اس طرح اصولی سوال قائم کر کے مسئلہ پر گفتگو نہیں کی گئی ہے۔ لیکن اجمالی طور پر نصوص سے استنباط کر کے لوگوں نے تین رائیں قائم کی ہیں۔

۱)　علت القتال کفر ہے۔اس کی دلیل ﴿وقاتلوهم حتىٰ لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله﴾ سورۂ انفال:۳۹۔(ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ''فتنہ'' نہ بچے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے خالص ہو جائے۔) واضح رہے کہ ہماری کتب تفسیر میں فتنہ کی تفسیر شرک سے بھی کیے جانے کی روایت موجود ہے۔اور **ويكون الدين لله** تو ظاہر ہے ہی۔

۲)　علت القتال کفر نہیں ہے بلکہ کفر کی حکومت ہے۔اس رائے کے حاملین کی اصل دلیل مندرجہ بالا آیت ہی ہے، یہ حضرات اس میں دین کو اطاعت اور قانون کے معنیٰ میں لیتے ہیں۔

۳)　علت القتال دفاع ہے، یہ حضرات قرآن کی آیت ﴿وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا﴾ اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو ان سے جو تم سے جنگ کریں اور زیادتی نہ کرنا۔ البقرۃ۔ سے استدلال کرتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں ہی موقف اشکالات سے خالی نہیں ہیں۔

دو ضروری باتیں جن سے ان آیات کے صحیح فہم میں مدد ملتی ہے:

(۱)　ان اشکالات کے حل کے لیے قرآن مجید کی ان آیات کے گہرے مطالعے اور تدبر کی ضرورت ہے جو جہاد سے متعلق نازل ہوئیں۔ان کے سلسلے میں یہ اہم بات بطور اصول جان لینا بہت ضروری ہے کہ قرآن میں آیات جہاد کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو مسلمانوں پر جہاد کے فرض قرار پانے کے بعد سابق میں دیے ہوئے حکم کی تاکید، وضاحت یا تحریض و ترغیب کے لیے آئی ہیں، ان کا مقصد نئے احکام دینا نہیں تھا، بلکہ ان کو جنگ پر ابھارنا اور سستی و بزدلی سے بچا کر دشمن کے خلاف جوش جنگ پیدا کرنا تھا۔لہذا یہ آیتیں قانون جہاد کا بیان نہیں بلکہ تحریض اور ترغیب کی آیات ہیں۔اور اہل علم واقف ہیں کہ قانونی اور رزمیہ زبانوں میں بڑا فرق ہوا کرتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح نصوص اور خصوصاً حدیث کے نصوص میں ترغیب اور زجر و توبیخ کے لیے جو زبان اور اسلوب استعمال کیا جاتا ہے اس کو خالص اور ٹھیٹھ قانونی معنیٰ میں سمجھنے کے بجائے ترغیب و تحریض اور زجر و توبیخ کے فطری اسلوب کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اس کم علم کو ایک لمبے غور و فکر کے بعد پورا اطمینان ہو گیا ہے کہ اس اصول کو مدنظر رکھا جائے تو بہت سے اشکالات اور تضاد کی غلط فہمیاں دور ہو جاتی ہیں۔

(۲)　اسی طرح قرآنی آیات کا مدعا اور ان میں دیے گئے احکام کی اصل نوعیت سمجھنے کے لئے ان کے پس منظر اور ان حالات کو جاننا بھی ضروری ہے جن کے درمیان وہ نازل ہوئیں۔کسی کلام کو اگر اس کے پس منظر سے کاٹ دیا جائے یا ان حالات کو نظر انداز کر دیا جائے جن میں وہ صادر ہوا ہے تو کچھ کا کچھ مطلب ہو جانا عین ممکن ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید کے سلسلے میں اس اصول کو مدنظر رکھنا اس لیے مزید ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ کسی تحریر کردہ کتاب کی طرح لکھا نہیں گیا کہ مصنف اس کے سیاق و سباق کو ذہن میں رکھتے ہوئے مرتب بات کرتا ہے اور قیود و شروط اور

وضاحتیں یکجا لکھتا جاتا ہے۔ اور نہ وہ قانون کی کسی کتاب کی طرح دفعات کی زبان میں نازل نہیں ہوا ہے۔ اس کا نزول تو حالات اور واقعات کے ساتھ ساتھ اس طرح ہوتا تھا کہ جب جس رہنمائی، ترغیب وتحریض، ترہیب یا زجر وتوبیخ کی ضرورت پڑی وہ آگئی۔ اس کے صحیح فہم کے لئے ضروری ہے کہ ان واقعات کی کھوج کی جائے جن میں کوئی خاص مجموعۂ آیات نازل ہوا تھا اور ذہن وتصور کو اس ماحول میں پہنچانے کی پوری کوشش کی جائے۔

جہاد کے سلسلے میں یہ بات یقینی طور پر سامنے آتی ہے کہ سلف وخلف کے یہاں بڑی حد تک عام تصور یہی ہے کہ مسلمانوں کی حکومت غیر مسلموں سے صلح صرف مجبوری کی حالت میں (یعنی مقابلہ سے عاجزی، یا ایسی صورت میں جب کہ مسلمانوں کی مصلحت کا تقاضا ہو تو) ہی کرسکتی ہے۔ مثلاً فقہ حنفی کی اہم کتاب ''بدائع الصنائع'' میں ہے کہ:

صلح کے جائز ہونے کی شرط ضرورت ہے، یعنی یہ کہ مسلمان اس لئے صلح کریں کہ جنگ کی تیاری کریں گے، اور یہ ایسی صورت میں ہی ہوسکتا ہے کہ مسلمان کمزور ہوں اور کفار کو قوت حاصل ہو، لہذا بغیر اضطرار کے صلح جائز نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ صلح کا نتیجہ فریضۂ جنگ کا ترک ہے۔ اس لئے یہ اس وقت ہی جائز ہوگی جب یہ جنگ کے وسیلہ کے طور پر ہو، اس لئے کہ ایسی صورت میں صلح درحقیقت جنگ ہی مانی جائے گی کہ وہ جنگ کی تیاری کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فلا تهنوا وتدعوا إلى السلم وأنتم الأعلون والله معلم﴾ (یعنی کمزوری مت دکھاؤ کہ صلح کی دہائی دینے لگو، اور تم ہی برتر ہوگے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے) ہاں مجبوری میں کوئی حرج نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کہتا ہے ﴿وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله﴾ (یعنی، اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہوجانا، اور اللہ پر بھروسہ کرنا)

(نیز ملاحظہ ہو: الأم، باب المهادنة، شرح السير الكبير، باب الموادعة)۔

بعض فقہاء نے صلح کے جواز کے لئے اضطرار اور مجبوری کی سخت شرط نہ لگاتے ہوئے ذرا نرم لفظ مصلحت یا مسلمانوں کے مفاد کا خیال (النظر للمسلمين) جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ (ملاحظہ ہو: الأم للشافعي، كتاب الجهاد، باب المهادنة على النظر للمسلمين. نيز شرح السير الكبير للسرخسي).

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ علماء نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ: فإذا لم يكن في الموادعة مصلحة فلا يجوز بالإجماع. (شرح فتح القدير، كتاب السير، باب الموادعة)

(اگر صلح میں مسلمانوں کی مصلحت نہ ہو تو بالاجماع ناجائز ہے)

تقریباً تمام ہی مسالک کی کتابوں میں اس قسم کی تصریحات ملتی ہیں۔ بلکہ یہ مزید وضاحت بھی فقہاء کرتے ہیں کہ اگر دوسرا ملک صلح کی پیشکش بھی کرے تو حاکم دیکھے گا اگر مسلمانوں کی مصلحت ہوگی تو قبول کرسکتا ہے اور اگر مسلمانوں کا فائدہ نہ ہو تو قبول نہیں کرے گا۔ (الأم: باب مهادنة من يقوى على قتاله، المبسوط باب صلح الملوك والموادعة)

بہر حال اس سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ عموماً علماء وفقہاء کے نزدیک قتال کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مخالف کی طرف سے جارحیت وظلم یا مذہبی جبر (جسے قرآن نے فتنہ کہا ہے) پایا جائے۔ بلکہ مقدور ہو اور کوئی نقصان یا مضرت نہ ہو تو ہر غیر مسلم حکومت سے جنگ ہی کی جائے گی۔

علت القتال کیا ہے؟ اب اس پر سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ جنگ جو اصلاً خونریزی ہے اور قرآن اس کو شر ہی کہتا ہے، کہیں اس کو "البأساء" (خرابی) کا نام دیتا ہے اور کہیں اس کو شر مانتے ہوئے بڑے شر یعنی ظالمانہ مذہبی جبر کے لئے ایک ناگزیر اقدام بتاتا ہے، ایسی صورت میں اس جنگ کا سبب اور علت کیا ہے؟ کیا صرف کفر ہے؟؟ یا کفر تو نہیں بلکہ "شوکت کفر" یا غیر اسلامی حکومت ہے؟؟۔

اگر چہ فقہاء امت کی تصریحات کے تجزیے سے یہ بات تو غلط ہی ثابت ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک قتال کی علت کفر ہے۔ لیکن اس کے باوجود علماء کے یہاں استثنائی طور پر اس قسم کی عبارتیں ملتی ہیں کہ قتال کی علت کفر ہے۔ مثلاً امام قرطبی سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۳ ﴿وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله﴾ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"یہ مطلقاً قتال کا حکم ہے۔ اس میں کفار کے حملہ میں ابتداء کرنے کی شرط نہیں ہے۔ اس کی دلیل ﴿ويكون الدين لله﴾ (یہاں تک کہ دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے) ہے، اور یہ حدیث بھی کہ "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ "لا إله إلا الله" پڑھ لیں"۔ اس آیت اور حدیث میں اس کی دلیل ہے کہ قتال کا سبب کفر ہے۔"

البتہ یہ اصول جمہور علماء وفقہاء کے قول سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک اگر غیر مسلم اپنے کفر پر باقی رہتے ہوئے مسلم حکومت کے تابع ہو کر جزیہ کی ادائیگی پر صلح کر لیں تو یہ معاہدہ قبول کرنا لازم ہوگا۔ اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے "کفر" بطور ایک نظریہ ومذہب دنیا میں قابل برداشت چیز ہے، اور اس کا خاتمہ جنگ کی غایت نہیں۔ اگر قتال کی علت کفر ہوتی تو اس وقت تک جنگ جاری رہنی چاہئے جب تک تمام کفار مسلمان ہو جائیں، اور یہ جائز نہ ہوتا کہ جزیہ پر صلح کر لی جائے۔ یہاں تک کہ ہتھیار ڈالنے والوں کے لئے بھی بس دو ہی راہیں ہوتیں: یا اسلام قبول کریں یا قتل کیے جائیں۔ اس طرح یہ نظریہ قرآن کے بیان کردہ بنیادی اصول ﴿لا إكراه في الدين﴾ (دین میں کوئی زبردستی نہیں) کے صریح منافی قرار پاتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ نفس کفر جنگ کا سبب یا علت قتال ہے تو کفر تو جنگ کے خاتمے کے بعد بھی باقی رہتا ہے، اس کا خاتمہ تو جنگ کے بعد بھی نہیں ہوتا۔

اس تجزیاتی غور وفکر کے بعد متقدمین فقہاء وعلماء کے نقطۂ نظر کے اصول کے طور پر ہمارے سامنے یہ نظریہ آتا ہے کہ قتال کی اصل علت شوکت کفر یا غیر مسلم حکومت کا وجود ہے۔ اس نظریے کی رو سے کفر جنگ کا سبب نہیں ہے۔ غیر مسلم بطور مسلم ریاست کے شہری (ذمی) کے اپنے کفر پر باقی رہ سکتے ہیں ہاں اگر مسلمانوں کو قدرت ہوگی تو وہ جنگ کر کے غیر مسلموں کی حکومت کو بے دخل کر کے عوام پر اسلام اور مسلمانوں کی حکومت ضرور قائم کریں گے۔

(ہم آگے اس موقف کی مدلل حمایت کر کے اپنا یہ نقطۂ نظر ظاہر کریں گے کہ یہ (اپنے زمانے اور ماحول میں) ایک بالکل برحق اور منصفانہ موقف تھا)۔

سب سے اہم سوال: مگر یہاں سوال یہ قائم ہوتا ہے کہ کسی غیر مسلم قوم کو کس جواز کی بنا پر اپنے اس حق سے محروم کیا جارہا ہے کہ وہ اپنے اوپر اپنے لوگوں کی اور اپنے پسندیدہ اصولوں اور نظریات کے مطابق حکومت قائم کرے؟؟؟ اس سوال کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ عام انسانی اخلاقی حس کے مطابق یہ موقف ایک اشکال کا باعث بنتا ہے کہ مسلم ریاست صلح صرف اپنی مصلحت اور ضرورت کے تحت ہی کرسکتی ہے، قدرت وطاقت ہو تو اس کو ہر مملکت سے جنگ ہی کرنی ہے چاہے وہ کیسی ہی بے ضرر اور صلح جو ہی کیوں نہ ہو۔

مولانا مودودی کا نظریہ: اب سے دو صدیوں پہلے جب مغرب کی فوجی یورش کے پہلو میں مسلمان اور اسلامی عقائد واحکام بھی فکری یلغار کا نشانہ بنے تو جو دلیر اسلام کے دفاع کیلئے سب سے پہلے کھل کر سامنے آئے ان میں شبلیؒ ومودودیؒ کا نام نمایاں ہے۔ مؤخر الذکر کی کتاب اپنی شہرت اور اپنے پر اعتماد انداز کے اعتبار سے ممتاز ہے اور مصنف کی محنت اور مآخذ کی کثرت کی شاہد بھی۔ لیکن کتاب میں آبشار کا جوش اور فکر وخیال کی روانی تو ہے مگر فاضل مصنف اس وقت نہایت کم عمر بھی تھا اور اسکو کتاب ہفتہ وار اخبار (الجمعیۃ) کی متواتر قسطوں میں پیش کرنی تھی، اسلئے اسکے پاس غور وتدبر کیلئے وقت بھی کم تھا۔

موصوف کے سامنے جب یہ سوال آیا کہ ایک طرف تو قرآن مذہب کے معاملے میں جبر واکراہ کی کھلی نفی کرتا ہے تو پھر اس کی کیا توجیہ کی جائے کہ صدیوں پر مشتمل اسلامی فکر کا حاصل یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو مسلمان ریاست جنگ ہی کرے گی، صلح صرف مصلحۃً ہی کی جائیگی۔ موصوف کی عبقری ذہانت نے اسکا جو حل دریافت کیا وہ بہت سے لوگوں کے لیے اسلامی فلسفہ بن چکا ہے۔ مولانا مرحوم کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ اسلام انفرادی طور پر ہر فرد بشر کو مذہبی آزادی تو دیتا ہے، لیکن وہ اسلام کے مخالف عقیدہ وفکر کو حکومتی طاقت اور شوکت رکھنے کی اجازت نہیں دیتا، اسلئے کہ (انکے بیان کے مطابق) قرآن میں جن چیزوں کو فتنہ اور فساد کہا گیا اور جنکے خاتمے کو جہاد وقتال کا مقصد اور غرض وغایت بتلایا گیا ہے وہ ''سب کی سب ایک ناحق شناس، ناخداترس اور بداصل نظام حکومت سے پیدا ہوتی ہیں'' (الجہاد فی الاسلام ص ۱۱۷)۔

عالم عرب میں مولانا کے ایک خاص خوشہ چیں انقلابی مفکر سید قطبؒ ہوئے، جو اپنے انقلابی فکر اور جوش تحریر میں مولانا مودودیؒ سے کہیں آگے تھے۔ مصر میں ناصر کے آمرانہ استبداد کے زمانے میں جب عموماً اسلام پسند حکومت کی مغرب پرستی سے سخت نالاں تھے اور دین دشمن حکمرانوں کی مخالفت کی پاداش میں اخوان پر سخت مظالم کا سلسلہ جاری تھا، سید قطب کا شعلہ بار قلم (جس کے جوش وزور کی کوئی نظیر معاصر عربی ادب میں نہیں پائی جاتی) اسلامی انقلاب کی ندا لگا رہا تھا۔ سید قطب نے مولانا مودودی کے دیگر تحریکی نظریات کی طرح اس فلسفے کو بھی اخذ کیا اور اپنی تفسیر میں اور (دیگر تصنیفات میں بھی) مولانا مودودی سے کہیں زیادہ قوت اور تفصیل وتکرار سے بیان کیا۔ یہاں تک کہ یہ ایک حد تک

مقبول نظریہ بن گیا۔

مولانا نے بھی فقہاء کی بیان کردہ تفصیلات کا خلاصہ اور حاصل یہی اخذ کیا کہ مسلمانوں کے لئے یہ بات شرعی فریضہ کا درجہ رکھتی ہے کہ اگر حالات اجازت دیں تو وہ ہر غیر مسلم قوم سے حکومت چھین لیں اور ان پر مسلمانوں کی (بلکہ مولانا کے الفاظ میں اللہ کے صالح بندوں کی) حکومت قائم کریں۔

یہ کم علم اپنی کم علمی کے احساس کے باوجود پورے یقین کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ اس موقف کی کیسی ہی مؤثر ترجمانی کی جائے مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ (کم سے کم اِس زمانے میں) یہ اشکال کا باعث ہے۔ اگر کوئی حکومت نہ اپنے عوام پر کسی سخت ظلم کی مرتکب ہے اور نہ دوسری قوموں پر کسی جارحیت کی مجرم، ساتھ ہی وہ اپنے یہاں بسنے والے مسلمانوں کو اللہ کے دین پر چلنے کی مکمل اجازت دیتی ہے، اور اللہ کے دین کی دعوت کے سامنے رکاوٹ بھی نہیں بنتی اور مسلمانوں کی حکومت کی طرف صلح وآشتی کا ہاتھ بھی بڑھاتی ہے تو کس اخلاقی جواز کے تحت اس حکومت پر جنگ تھوپی جاسکتی ہے۔ اور کیسے کسی قوم کو اس فطری حق سے محروم رکھا جاسکتا ہے کہ اس کا سیاسی نظام اس کے اپنے لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ کسی قوم سے خودمختاری سلب کر لینا انسانی عرف میں یقیناً ظلم ہے۔

مولانا مودودیؒ اس اشکال کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ انہوں نے وکیل کی حیثیت سے اپنے موقف کے دفاع میں یہ نظریہ پیش کیا کہ قرآن نے فتنہ کے خاتمہ کو قتال کا مقصد کہا ہے۔ اب ایک نظر ڈالی جائے کہ قرآن میں کن کن برائیوں کو ''فتنہ'' یا ''فساد'' کہا گیا ہے۔ ان برائیوں اور خرابیوں کو گنانے کے بعد مولانا فرماتے ہیں:

''اب اگر ان تمام برائیوں پر ایک غائر نظر ڈالی جائے جن کو فتنہ وفساد سے تعبیر کیا گیا ہے تو اس سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ وہ سب کی سب ایک ناحق شناس، ناخدا ترس، اور بداصل نظام حکومت سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر کسی برائی کی پیدائش میں ایسی حکومت کا براہ راست کوئی اثر نہیں ہوتا تو کم از کم اس کا باقی رہنا اور اصلاح کے اثر سے محفوظ ہونا تو یقیناً اسی حکومت کے باطل پرور اثرات کا رہین منت ہوتا ہے''۔ (الجہاد فی الاسلام ص:۱۱۷)

اسی وجہ سے مولانا کے بقول اسلام نے بدی کے خاتمے کے لئے حکم دیا کہ ایک منظم جدوجہد (جہاد) کے ذریعہ اور اگر ضرورت پڑے اور ممکن ہو تو جنگ کر کے ایسی تمام حکومتوں کو مٹا دیا جائے۔ اور اسکی جگہ وہ عادلانہ نظام حکومت قائم کیا جائے جو خدا کے خوف اور اسی کے نازل کردہ ضابطوں پر مبنی ہو اور جو انسانوں کے مفاد کی خدمت کرے (الجہاد فی الاسلام ص ۱۱۷۔۱۱۸ باختصار)۔

اس نظریہ کے خلاف تین طاقت ور دلائل:

(۱) اس نظریہ کے خلاف سب سے پہلے جو چیز جاتی ہے وہ یہ کہ اسلام کی ایک بنیادی تعلیم دین کے معاملے میں آزادی اور انصاف ہے۔ کسی قوم کو اپنی حکومت سے بے سبب محروم کرنا اور اس پر دوسری قوم کی حکومت قائم کرنا فطری طور پر انصاف کے خلاف نظر آتا ہے۔ اسلامی دعوت کے لئے ضروری ہے کہ اسلام اپنے زمانے میں سب سے برتر اور

متوازن اخلاقی معیار پر قائم نظر آئے۔ اگر ایسا نہیں ثابت ہوتا تو اسلام کا اکیلے محفوظ ہدایت ربانی اور قانون الٰہی ہونے کا دعوی مشتبہ ہو جائے گا۔ لہذا علماء اسلام کا اہم ترین فریضہ قرار پاتا ہے کہ وہ ہر زمانے میں پوری بیدار مغزی سے اپنے زمانے کے حالات کا جائزہ لیں اور بلا خوف لومۃ لائم قرآن وسنت پر مبنی اسلامی قوانین کا اظہار کریں۔ اس میں ان کو نہ باطل کی یورش کا خوف ہو نہ کسی قسم کی بدنامی کا اور نہ اپنوں یا غیروں کی ملامت کا۔

(۲) دوسری جو چیز اسی نظریہ کے خلاف جاتی ہے وہ یہ آیت قرآنی ہے: ﴿وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل علىٰ الله﴾ یعنی اگر یہ خدا اور مسلمانوں کے دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح پر آمادہ ہو جانا۔

یہ آیت غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوئی۔ اس سے صلح کا کس درجہ مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے اس کے لیے صرف سادہ سا مطلب جان لینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے سیاق وسباق پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کس درجہ اس کو اہمیت دیتا ہے کہ فریق مخالف اگر آمادۂ صلح ہو تو صلح کر ہی لی جائے۔ اس آیت میں غور سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا حکم مجبور وکمزور کی زبی کچلی صلح کا نہیں ہے، نہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ صلح میں ہمارا فائدہ ہے کہ نہیں۔ یہ سورت انفال کی آیت ہے۔ اس سورت میں مسلمانوں کو مکہ کے مشرکین سے جنگ کے احکام دیے گئے اور ایک طویل سلسلۂ آیات میں مسلمانوں کے اندر قتال کے لئے جوش وحمیت پیدا کی گئی ہے۔ یہی سلسلۂ بیان جب اپنے عروج پر یہاں پر پہنچا کہ **واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم.**:

''اور ان دشمنانِ خدا کے مقابلے کے لئے جو ہو سکے وہ اسلحہ تیار کرو (اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرو۔) اور گھوڑے جنگ کے لئے تیار رکھو، جس سے تمہارا رعب اللہ کے دشمن اور تمہارے دشمن کے دل میں بیٹھے۔''

اور اس کے بعد اس جہاد وقتال کی تیاری میں اپنا مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی۔ جہاد وقتال پر آمادہ کرتے ہوئے، اور جہاد وقتال کے لیے جوش دلانے والے اسی ولولہ خیز سلسلۂ کلام میں ارشاد ہوتا ہے کہ: **وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل علىٰ الله، انه سميع عليم. وان يريدوا ان يخدعوك فان حسبك الله.** (الانفال: ۶۱-۶۲) ''اگر یہ (خدا و مسلمانوں کے دشمن، اپنی دشمنی کے باوجود) مصالحت کی طرف جھکتے ہیں تو تم بھی اس کی طرف جھک جانا، اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک وہ (سب) سننے اور جاننے والا ہے۔ اگر ان کی نیت تم کو دھوکہ دینے کی ہوگی تو اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔''

کلام کے سیاق وسباق پر غور کیجئے۔ یہ موقعہ مسلمانوں کو مشرکین مکہ کے خلاف جنگ پر آمادہ کرنے اور ان میں اس کی تیاری کے لئے جوش وحمیت پیدا کرنے کا ہے۔ پھر بھی کہا جاتا ہے کہ دشمن اگر صلح پر آمادہ ہوتا ہے تو صلح کرنے کا حکم ہے۔ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ دشمن صلح کے بہانے دھوکہ نہ دے دے۔ سو اس کی پیش بندی کے طور پر پہلے تو کہا کہ صلح کرنے میں توکل علی اللہ کا مظاہرہ کرو۔ پھر مزید صراحت کی کہ اگر ان کے دھوکہ دینے کا اندیشہ ہو تو جان لو کہ اللہ پر توکل ہی تمہارا سرمایہ ہے۔ یعنی اس سلسلے میں اندیشہ ہائے دور دراز کا زیادہ خیال نہ کرو۔

کیا یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے؟ سید قطب مرحوم نے بڑے شدومد کے ساتھ اس رائے کی تائید کی ہے کہ صلح کر لینے کا یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ ان حضرات کو جو اس آیت کو غیر منسوخ قرار دیتے ہیں سید قطب ان کو ''المهزومون روحيا وعقليا'' (عقلی اور روحانی اعتبار سے شکست خوردہ) قرار دیتے ہیں، سادگی اور حماقت سے موصوف کرتے ہیں اور اسلام کے مزاج و منہاج سے بے خبر بتاتے ہیں۔

حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ اس آیت کو منسوخ قرار دینے کی کوئی دلیل نہیں ہے، مفسرین اور فقہاء کی ایک تعداد اگرچہ یہ کہتی ہے کہ سورۂ توبہ کی یہ آیت اس کی ناسخ ہے۔

﴿فإذا انسلخ الأشهر الحرم فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم وخذوهم واحصروهم واقعدوا لهم كل مرصد﴾ (اور جب اشہر حرم گذر جائیں تو جہاں پاؤ ان مشرکین کو قتل کر دو ان کو پکڑو، گھیرو، اور ہر جگہ ان کے (قتل کے لئے) گھات لگا کر بیٹھو)۔

یقیناً سورۂ انفال کی وہ آیت جو دشمن کے آمادۂ صلح ہونے پر صلح کا حکم دے رہی ہے وہ پہلے نازل ہوئی ہے اور سورۂ توبہ کی آیت بعد میں، مگر جنگ کا حکم دینے والی سورت توبہ کی ان آیات کے سیاق وسباق پر ذرا غور کرنے سے قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ احکام مشرکین عرب (جو قریش کی قیادت میں ایک ملت اور سیاسی اتحاد کا درجہ رکھتے تھے) کے لئے نازل ہو رہے تھے۔ آپ اول سورت سے آیت نمبر ۲۸ تک پڑھ جایئے قطعی طور پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ سورت عرب کے مشرکین سے متعلق ہی گفتگو کر رہی ہے۔ یہ گفتگو جن مشرکین کے متعلق کی جا رہی ہے دورانِ کلام ان کے جو حالات اور صفات بیان کی گئی ہیں اس سے کسی ذی شعور کے لئے شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ اس سلسلۂ کلام میں صرف مشرکین عرب مراد ہیں۔ مثلاً کہیں کہا جا رہا ہے کہ ''جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا'' آیت نمبر (۱)، پھر آگے ان کی صفت یہ بھی آیت نمبر ۱۳ میں بتائی جا رہی ہے کہ:

ألا تقاتلون قوما نكثوا أيمانهم وهموا بإخراج الرسول وهم بدؤوكم أول مرة

(کیا تم ان لوگوں سے جنگ نہیں کرو گے جنہوں نے عہد توڑ ڈالا، رسول کو در بدر کرنے کا ارادہ کیا اور انہوں نے ہی تمہارے خلاف جنگ چھیڑی ہے)۔

ظاہر ہے معاہدہ مشرکین عرب سے ہی ہوا تھا۔ المشرکین سے مراد مشرکین عرب ہی ہیں اس کو مزید مؤکد کرنے والی آیات آگے اور ہیں جن میں ان کے مسجد حرام (کعبہ) سے رشتہ کا ذکر کر کے کہا جا رہا ہے کہ اب ان سے اس کی تولیت چھینے جانے کا وقت آ گیا ہے (۱۷-۲۲)۔ پھر آیت نمبر (۳۶) نے تو کسی شبہہ کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔ ارشاد ہوتا ہے: وقاتلوا المشركين كافة كما يقاتلونكم كافة

"تمام مشرکین سے جنگ کرو جیسا کہ وہ سب کے سب تم سے جنگ کر رہے ہیں۔"

سورت انفال میں پہلے انہی مشرکین کے بارے میں حکم دیا گیا تھا کہ ''اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل

ہوجانا'' مگر قرآن خود بتا رہا ہے کہ اس حکم کی تبدیلی کا سبب ان کی لگاتار جارحیت، ظلم وعدوان، اور عہد شکنی کی تاریخ ہے، جیسا کہ ابھی ذکر کی گئی آیتوں میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ ان کے سینوں میں عداوت کی جہنم ہے، وہ کسی رشتہ وقرابت اور معاہدے تک کا لحاظ نہیں کر رہے لہذا اب بس، ان کو تہ تیغ کرو، یہاں قرآن ان کو بد عہدی اور ظلم واعتداء کا مرتکب بھی بتا رہا ہے، ﴿لا یرقبون فی مؤمن إلا ولا ذمة وأولئك هم المعتدون﴾۔ لہذا یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ان کو ہر حال میں تہ تیغ کرنے کا حکم کا سبب ان کی بے اعتباری اور یہ اعتداء تھا۔

قرآن کی کسی آیت کو اس معنی میں منسوخ قرار دینا کہ وہ معطل کردی گئی ہے اور اب اس پر عمل نہیں کیا جائے گا ایک بڑی بھاری باتی ہے۔ اتنی پرخطر بات کہنے کے لئے کوئی یقینی بنیاد ہونی چاہئے، جو یہاں ہرگز نہیں ہے۔ صلح کا حکم دینے والی آیت بالکل الگ قسم کے حالات اور الگ دشمن کے لئے ہے اور سورۂ توبہ کی آیات الگ صورت حال میں ایک متعین دشمن سے جنگ کرنے اور اس کے لئے زمین تنگ کردینے کے حکم پر مشتمل ہے۔

صلح کا حکم قرآن نے اس صورت میں دیا ہے جب دشمن صلح جو ہو۔ کہا گیا اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی مائل بہ صلح ہوجانا اور اس پر یہ اضافہ کیا گیا کہ دشمن سے اگر عہد شکنی کا اندیشہ ہو تب بھی اللہ کے بھروسے پر صلح کر ہی لی جائے اور سورۂ توبہ کی آیت جو دشمن سے بھرپور جنگ کرنے کا حکم دے رہی ہے وہ بتا رہی ہے کہ جن "المشرکین" کے بارے میں یہ حکم ہے وہ یہی نہیں کہ صلح جو نہیں بلکہ تم سے جنگ کر رہے ہیں اور ایسے عہد شکن ہیں کہ اب ان کی صلح پر آمادگی کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی سلسلۂ آیات میں آگے کہا گیا: ﴿وقاتلوا المشرکین کافة کما یقاتلونکم کافة﴾ اور تمام مشرکین سے جنگ کرو جس طرح وہ سب کے سب تم سے جنگ کرتے ہیں۔

سورۂ انفال کی یہ آیت (۶۱) دوسرے فریق کے صلح پر (یقیناً بامعنی اور منصفانہ صلح پر) راضی ہونے کی صورت میں اس کو نہ صرف قبول کرنے بلکہ کشادہ قلبی کے ساتھ قبول کرنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس لئے کہ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ اصلاً تو گفتگو مسلمانوں کو آمادۂ جنگ کرنے کی چل رہی تھی مگر پھر بھی مسلمانوں میں صلح پر آمادگی پیدا کرنے کے لئے یہاں تک ارشاد ہوا: وتوکل علی اللہ إنه هو السمیع العلیم وإن یریدوا أن یخدعوك فإن حسبك الله هو الذي أیدك بنصره وبالمؤمنین

''اور (اس سلسلہ میں) اللہ پر بھروسے سے کام لو۔ وہ سب سننے جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ تم کو دھوکہ دینا چاہیں گے تو اللہ کافی ہے تمہارے لئے۔ اسی نے تو اپنی مدد اور مؤمنین کی جماعت کے ذریعہ تمہاری تائید کی ہے۔''

اس کی تشریح میں ابن کثیر کہتے ہیں کہ ''مطلب یہ ہے کہ اگر وہ صلح کر کے دھوکہ دینا چاہیں تاکہ اسی مدت میں تیاریاں کرلیں تو جان لو کہ اللہ تمہارے لئے کافی ہے''۔

اس پوری تفصیل نے یہ بات واضح کردی کہ سورۂ توبہ کی آیات صلح کی آیت کو منسوخ نہیں کر رہی ہیں۔ نسخ کی کوئی دلیل

نہیں ہے۔ دونوں آیات قطعی طور پر الگ حالات اور الگ دشمنوں سے متعلق ہیں۔ کوئی اگر خود قرآن میں غور کرے اور اگر اپنے ذہن میں قائم خیالات اور کسی مخصوص نظریے کے تاثرات سے آزاد ہو کر سوچے تو وہ اسی نتیجے تک پہنچے گا، اور کتاب اللہ کی آیات کو مصحف میں موجود ہوتے ہوئے اور تلاوت کرتے ہوئے بلا قطعی دلیل کے ہرگز یہ نہیں کہے گا کہ وہ منسوخ اور معطل ہیں۔ جیسا کہ امام طبری جو سرخیل مفسرین ہونے کے ساتھ ساتھ حدیث وفقہ میں بھی امامت کے مقام پر فائز تھے اس آیت کے منسوخ ہونے کی بات بالکل بے بنیاد قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: لا دلالة علیه من کتاب ولا سنة ولا فطرة ولا عقل. اس کی کتاب وسنت اور عقل وفطرت سے کوئی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی۔

ہاں سورۂ محمد کی ایک آیت میں کمزوری دکھاتے ہوئے دشمن سے صلح کی دہائی دینے کو منع کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ایک بالکل دوسری بات ہے اور دشمن کے ساتھ باعزت صلح ایک دوسری چیز ہے۔

(۳) تیسری ایک بات اور ہے جو قطعی طور پر اس کا فیصلہ کر دیتی ہے کہ خود ہمارے فقہاء کے نزدیک غیر مسلم حکومت خود اپنی ذات میں ایسی چیز نہیں ہے جس کو برداشت ہی نہیں کیا جاسکتا اور مسلمانوں پر اس کو ختم کرنا دینی فریضہ ہے۔ فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اگر غیر مسلم حکومت کی طرف سے کچھ مال دے کر صلح کی پیش کش کی جائے تو مسلمانوں کی حکومت کے لئے جائز ہے کہ وہ اس مال کو قبول کر کے غیر مسلم حکومت کو باقی رہنے دے اور صلح کر لے۔ فقہاء نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ یہ ''جزیہ'' والی صورت نہیں ہوگی بلکہ غیر مسلم حکومت اپنی پوری آزادیوں اور کفر کے قوانین کے نفاذ کے ساتھ باقی رہے گی۔

اب اگر مولانا مودودیؒ کی بات کو تسلیم کر لیا جائے تو بات یہ ہوگی کہ یوں تو اگرچہ ایک غیر مسلم حکومت سارے فتنہ وفساد کی جڑ اور خرابیوں کا منبع ہے اس لئے اس کو اکھاڑ پھینکنا اور اس کی جگہ اہل حق کی حکومت قائم کرنا ضروری ہے، لیکن اگر مال ملے تو پھر سب قابل برداشت ہوسکتا ہے۔ ذرا غور فرمائیں! یہ تو کوئی اخلاقی پوزیشن نہیں ہوئی۔ اللہ کا دین یقیناً اس سے بری ہونا چاہئے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے ائمہ اور فقہاء متقدمین کے موقف کی جو یہ توجیہ اور تشریح کی جاتی ہے کہ ''شوکت کفر علت قتال ہے'' یا یہ کہ غیر مسلم حکومت کا وجود فی نفسہ اس بات کا مکمل سبب ہے کہ اگر قدرت ہو تو اس کو ختم کرنے کے ہدف سے اس کے خلاف جنگ کی جائے اور مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے کہ اگر ممکن ہو تو وہ غیر مسلم حکومت کا خاتمہ ضرور کریں، یہ صحیح توجیہ نہیں ہے۔ فقہاء کا یہ متفقہ مسئلہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ان کے نزدیک نہ کفر قتال کا سبب ہے نہ نظام کفر نہ حکومت کفر، کیوں کہ وہ سب مال کے عوض غیر مسلم حکومت سے صلح کرنے کو جائز کہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو غیر مسلم حکومت مال دینے پر اسی وقت راضی ہوگی جب مسلمانوں کی طاقت کا پلہ بھاری ہو، یعنی یہ بات بھی نہیں کہی جاسکتی کہ ہمارے فقہاء نے اس کی اجازت اسی صورت میں دی ہے جب مسلمان کمزور ہوں یا خود ان کی مصلحت کا تقاضہ ہو کہ جنگ سے بچا جائے۔

بعض قدیم علماء کی صراحتیں کہ جنگ کا سبب محاربہ ہے:

اگر چہ ہمارے قدیم فقہاء کے یہاں یہ تصور نا پید نہیں ہے کہ نفس کفر جنگ کا سبب نہیں ہوسکتا۔ جنگ کا سبب محاربہ یعنی جارحیت ہے۔امام ابن تیمیہ کا تو اس مسئلے پر مستقل رسالہ ''قاعدة مختصرة في قتال الكفار ومهادنتهم '' بھی ہے۔جس میں انہوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ جنگ صرف اسی سے کی جائے گی جو خود آمادۂ پیکار ہو۔(قاعدۃ مختصرۃ في قتال الكفار ص ۱۲۱)

بعض علماء اس رسالہ کی ابن تیمیہ کی طرف نسبت مشکوک قرار دیتے ہیں۔مگر نیل الأوطار میں ایک جگہ شوکانی کے قلم سے اس رسالہ کا تذکرہ دیکھا تو اندازہ ہوا کہ شوکانی کے پاس غالباً اس کا نسخہ تھا۔علامہ شوکانی نے لکھا ہے کہ

وكون قتال الكفار لكفرهم هو مذهب طائفة من أهل العلم ، وذهبت طائفة أخرى إلى أن قتالهم لدفع الضرر ... ومن القائلين بهذا شيخ الإسلام ابن تيمية وله في ذلك رسالة (نيل الأوطار)

(اور کفار سے قتال کا سبب ان کا کفر ہے، یہ بعض اہل علم کی رائے ہے، اور ایک دوسری جماعت کا موقف یہ ہے کہ قتال ان کے ضرر کو دفع کرنے کے لئے ہے...اس دوسری رائے کے حاملین میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ بھی ہیں اور ان کا اس موضوع پر ایک رسالہ بھی ہے۔)

اس رسالہ کا تذکرہ شوکانی سے پہلے علامہ امیر صنعانی کے یہاں بھی ملتا ہے، بلکہ انہوں نے اس کی تائید کرتے ہوئے اپنے ایک رسالہ میں اس کی تلخیص بھی کی ہے جو ذخائر علماء الیمن نامی کتاب میں شائع ہو چکی ہے۔

ابن تیمیہ نے اپنی دوسری کتاب النبوات میں بھی اس رائے کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے، بلکہ اس کو جمہور علماء کا مسلک قرار دیا ہے، کہتے ہیں: الكفار إنما يقاتلون بشرط الحراب ، كما ذهب إليه جمهور العلماء ، وكما دل عليه الكتاب والسنة (النبوات ص: ١٤٠)

(کفار سے جنگ اسی شرط پر کی جائے گی کہ وہ محاربہ کریں، جیسا کہ جمہور علماء کا مسلک ہے اور اسی پر کتاب وسنت کی دلیل قائم ہے۔)

ابن تیمیہ اور شوکانی کی ان عبارتوں سے یہ قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کے نزدیک ماضی میں بھی اہل علم کی ایک تعداد اسی کی قائل رہی ہے کہ قتال صرف ظلم وجارحیت کے خلاف ہی کیا جاسکتا ہے اور اس کی اصل علت محاربہ (یا فتنہ وغیرہ) ہی ہے۔ابن تیمیہ اپنی کتاب الصارم المسلول میں آیت کریمہ: ''اور اللہ کے راستہ میں قتال کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں، اور زیادتی مت کرنا، اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔(البقرۃ:۱۱۹) کو نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں:

فأمر بقتال الذين يقاتلون ، فعلم أن شرط القتال كون المقاتَل مقاتِل ۔ (الصارم المسلول: ۲۸۲) ''اللہ نے جنگ کرنے والوں سے قتال کرنے کا حکم دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قتال کے لئے یہ شرط ہے کہ جس کے خلاف جنگ چھیڑی جائے وہ جنگ کر رہا ہو۔''

• ابن قیمؒ اپنی کتاب ہدایۃ الحیاری میں کہتے ہیں:

إنما كان (صلى الله عليه وسلم) يقاتل من يحاربه ، وأما من سالمه وهادنه فلم يقاتله (هداية الحيارى: ۱۲۱)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اسی سے جنگ کرتے تھے جو خود جنگ کرتا تھا۔ جو صلح کرتا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے جنگ نہیں کرتے تھے)۔

اس موقف کا اظہار ہمیں طبری کے یہاں بھی ملتا ہے جنہوں نے اسی آیت صلح کی تفسیر کرتے ہوئے پہلے تو یہ غیر معمولی بات لکھی کہ: **وان مالوا الی مسالمتک ومتارکتک الحرب، اما بالدخول فی الاسلام واما باعطاء الجزیۃ واما بموادعۃ ونحو ذلک من اسباب السلام والصلح فاجنح لها، یقول فمل الیها وابذل لهم ما مالوا الیه من ذلک وسألوک.**

یعنی اگر وہ (دشمن) تمہارے ساتھ صلح اور جنگ بندی پر آمادہ ہو جائے چاہے اسلام قبول کر کے یا جزیہ دے کر یا صلح کر کے، چاہے وہ کسی قسم کی اور کسی انداز کی بھی صلح ہو تو تم بھی صلح پسندی کا ثبوت دینا، اور وہ جو چاہیں وہ کر دینا اور دے دینا۔

پھر آیت کی اس اجمالی وضاحت کے بعد قتادہؒ اور بعض دیگر حضرات کے اس قول پر کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی بعد میں اجازت نہیں رہی، وہ تبصرہ کرتے ہیں جو پیچھے گذر چکا کہ: اس کی کتاب وسنت اور عقل وفطرت سے کوئی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی۔

دلائل پر ایک نظر:

جو حضرات اس کے قائل ہیں کہ مسلمانوں کو بشرط قدرت ساری غیر مسلم حکومتوں سے جنگ کرنے کا حکم ہے، ان سے بھی جو محاربہ یا ظلم کے مرتکب ہوں اور ان سے بھی جو کسی قسم کے محاربہ کے مرتکب نہ ہوں، ان حضرات کے اہم دلائل حسب ذیل ہیں: (۱) وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله (البقرة : ۱۹۳)

(اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ''فتنہ'' باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔)

اس آیت میں قتال کا جو دوسرا مقصد ''اور دین اللہ کیلئے خالص ہو جائے'' بتایا گیا ہے، اس میں بعض مفسرین نے

''دین'' کے معنی اطاعت کے بیان کیے ہیں (طبری)۔ یہیں سے یہ حضرات یہ استدلال کرتے ہیں کہ آیت مسلمانوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ تا حد مقدور اسلام کی حکومت کے قیام کیلئے قتال کریں، تا کہ قانون صرف اسلام کا باقی رہے۔

مولانا مودودیؒ اس استدلال کی ساحت یوں کرتے ہیں:

''اس مقام پر ''فتنے'' سے مراد وہ حالت ہے جس میں دین اللہ کے بجائے کسی اور کے لئے ہو، اور لڑائی کا مقصد یہ ہے کہ یہ ''فتنہ'' ختم ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو۔ پھر جب ہم لفظ ''دین'' کی تحقیق کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں دین کے معنی ''اطاعت'' کے ہیں، اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ نظام زندگی ہے جو کسی کو بالاتر مان کر اس کے احکام وقوانین کی پیروی میں اختیار کیا جائے۔ پس دین کی اس تشریح سے یہ بات خود واضح ہو جاتی ہے کہ سوسائٹی کی وہ حالت جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی وفرماں روائی قائم ہو، اور جس میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے، فتنے کی حالت ہے، اور اسلامی جنگ کا مطمح نظر یہ ہے کہ اس فتنے کی جگہ ایسی حالت قائم ہو، جس میں بندے صرف قانون الٰہی کے مطیع بن کر رہیں''۔ (تفہیم القرآن ۱/۱۵۱)

مولانا کی اس تشریح کا حاصل یہ ہے کہ ''فتنہ'' یہ ہے کہ اللہ کے قانون کے علاوہ کوئی دوسرا قانون نافذ ہو۔ اور ''دین کل کا کل صرف اللہ کے لیے ہو جائے'' کا مطلب یہ ہے کہ ''بندے صرف قانون الٰہی کے مطیع بن کر رہیں''۔ اقتباس کے خط کشیدہ الفاظ پر دوبارہ غور کریں تو یہ استدلال کمزور نظر آئے گا۔ اسلیے کہ چاہے دین اپنے اصطلاحی معنوں میں ہو یا آیت کے معنی یہ ہوں کہ اطاعت خالصۃً اور کل کی کل اللہ کی ہو جائے، اس سے یہ مراد لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے؟ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے اور اسلامی احکام کا قانونی نفاذ ہو بھی جائے تو بھی کفار اپنے شرک وکفر اور اللہ کی نافرمانی اور غیر اللہ کی اطاعت وبندگی پر قائم رہیں گے، ان کے احبار ورہبان ان کے لیے ناحق حلال وحرام کے فتوے دیتے رہیں گے اور اسلامی حکومت ان کے بہت سے معاصی وقبائح ومنکرات کا خاتمہ نہیں کرے گی۔ پھر اس آیت سے استدلال کے کیا معنی؟ مسلمانوں کی حکومت قائم ہو جائے اور اسلامی قانون کے نفاذ اور جزیہ کی تحصیل کے بعد بھی نہ دین اپنے معروف معنی میں اللہ کے لئے خالص ہوتا ہے اور نہ اطاعت، مشرکین کا شرک اور یہود ونصاریٰ کی اطاعت رہبان واحبار بھی باقی رہے گی اور کفار کے معاصی بھی، کوئی جہاد دنیا میں دین یا اطاعت کو اللہ کے لئے خالص نہیں کرتا، پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ جنگ کی غایت ''دین کا یا اطاعت کا اللہ کے لئے خالص ہو جانا'' ہے۔ جہاد کے نتیجے میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوگی تب بھی دین اللہ کے لئے خالص نہیں ہوگا نہ اطاعت اللہ کے لئے خالص ہوگی۔ یعنی نہ دین اللہ کے لیے خالص ہوگا اور نہ اطاعت۔

سادہ سے لفظوں میں آپ اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ جہاد کے نتیجے میں جو اسلامی حکومت قائم ہوگی وہ زمین پر کفر

کو بھی باقی رہنے دے گی اور (غیر مسلموں کے ذریعے) اللہ کی نافرمانیوں اور گناہوں کو بھی۔ لہذا جنگ کا ہدف دین یا اطاعت کا اللہ کے لیے خالص ہو جانا نہیں قرار دیا جا سکتا۔

بعض محترم علماء نے اس آیت میں دین کے معنی قہر و غلبہ کیلئے ہیں، جو یقیناً غلط فہمی ہے، ہم بصد ادب وضاحت کرتے ہیں کہ دین کے معنی عربی زبان میں قانون، اطاعت بدلہ وغیرہ کے تو آسکتے ہیں، قہر و غلبہ اور حکومت کے نہیں آتے۔

پھر آیت کا مطلب کیا ہے؟؟ اس مشکل کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ اس حقیقت واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ:

دراصل یہ آیت صرف مشرکین عرب کے سلسلہ کا حکم بیان کر رہی ہے۔ آپ ذرا اس کے سیاق پر غور کیجئے۔

﴿وقاتلوا في سبيل الله .....تا.....الا على الظالمين﴾ (البقرة : ۱۹۰۔۱۹۳)

(اور اللہ کے راستے میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کر رہے ہیں۔ اور زیادتی مت کرنا اللہ زیادتی کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اور ان کو قتل کرو جہاں پاؤ، اور وہاں سے ان کو نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے۔ اور ''فتنہ'' قتل سے سنگین تر ہے، اور ان سے مسجد حرام کے پاس جنگ مت کرنا جب تک وہ وہاں تم سے جنگ نہ کریں، اگر وہ مسجد حرام میں تم سے جنگ کریں تو تم ان کو قتل کرو۔ کافروں کا یہی بدلہ ہے۔ تو اگر وہ باز آجائیں (شرک سے) تو اللہ غفور و رحیم ہے۔ اور ان سے جنگ کرو اس وقت تک جب تک کہ فتنہ نہ ختم ہو جائے اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔ اگر وہ باز آجائیں (جنگ) سے تو کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی سوائے ظالموں کے (کسی پر)۔

آیات کا سیاق قطعی طور پر ان مشرکین مکہ کے ساتھ خاص ہے جنہوں نے اسلام کے خلاف جنگ چھیڑ رکھی تھی، جن کے خلاف مسلمانوں میں جوش حمیت پیدا کرنے کے لئے قرآن نے کہا تھا ﴿وهم بدؤوكم أول مرة﴾ : (انہوں نے ہی لڑائی کی ابتدا کی تھی)۔ ان مشرکین کے سلسلے میں یہ سلسلۂ آیات شروع ہی یہاں سے ہوا ہے کہ: ''اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں''۔ اس سلسلۂ بیان میں حکم دیا گیا ہے کہ ان مشرکین سے تم کو جنگ شروع کرنے کا جو حکم دیا جا رہا ہے اس کی عملی غایت اور انتہا یہ ہے کہ ان کا فتنہ ختم ہو جائے اور دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔ اس سیاق و پس منظر میں دین کے اللہ کے لئے اصل ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مشرکین جس علاقے یعنی جزیرۂ عرب کے باسی ہیں اس کے بارے میں یہ طے ہے کہ یہاں دین صرف اللہ کا ہی رہے گا۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض وفات میں وصیت فرمائی کہ: ''مشرکین کو جزیرۂ عرب سے نکال دیا جائے''۔ (صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب جوائز الوفد) اور یہی محمل ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور ارشاد: " أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله ....." ۔ مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ اس معنی کو حتمی طور پر طے کرنے والی یہ بات ہے کہ متفقہ طور پر لوگوں سے زبردستی اسلام قبول

کروانا جنگ کی غایت ہرگز نہیں ہے۔ اگر اس حدیث کو (مذکورہ بالا آیت کی طرح) جزیرۃ العرب کے ساتھ خاص نہ مانا جائے تو اسکے معنی یہ ہوں گے کہ مجھے لوگوں سے جنگ کرنے اور قتل وقتال کرنے کا حکم ہے الا یہ کہ وہ اسلام قبول کرلیں۔

تقریباً یہی الفاظ سورۂ انفال آیت ۳۹ میں بھی آئے ہیں، وہاں بھی سیاق یقینی طور پر مشرکین مکہ کو متعین کرنیوالا ہے

(۳،۲) اس موقف کے اہم دلائل میں سورۂ توبہ کی دو آیتیں بھی ہیں: قاتلوا الذين لا يؤمنون بالله ولا باليوم الآخر ولا يحرمون ما حرم الله ورسوله ولا يدينون دين الحق من الذين اوتوا الكتاب حتىٰ يعطوا الجزية عن يد وهم صاغرون۔ (آیت : ۲۹)

(جنگ کروان لوگوں سے جو ایمان نہیں رکھتے اللہ پر اور نہ آخرت کے دن پر اور دین حق کی اتباع نہیں کرتے، یعنی اہل کتاب سے، یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں ہاتھ سے اور تابع بن کر رہیں۔)

دوسری آیت اسی سورت کی یہ آیت ہے:

يا أيها الذين آمنوا قاتلوا الذين يلونكم من الكفار وليجدوا فيكم غلظة۔ (آیت:۱۲۳)

(اے ایمان والو! اپنے پاس کے کفار سے جنگ کرو، اور چاہئے کہ وہ تم میں سختی پائیں)۔

ان دونوں آیتوں سے استدلال اس طور پر ہے کہ پہلی آیت میں قتال کے حکم کے ساتھ اس حکم کی غایت یہ بتادی گئی کہ یہ اہل کتاب کفار مسلمانوں کے تابع ہوکر جزیہ دینے پر راضی ہوجائیں، تاکہ ان کی بالادستی اور خودمختاری ختم ہوجائے، وہ زمین میں صاحب اسر اور حاکم بن کر نہ رہیں، بلکہ زمین کے نظام زندگی کی باگیں اور امامت وفرماں روائی کے اختیارات دین حق کی اتباع کرنے والوں کے ہاتھوں میں آجائیں۔ دوسری آیت بھی مطلقاً کفار سے جنگ کرنے کا حکم دیتی ہے، اور اس میں کہیں اس کا اشارہ بھی نہیں ہے کہ وہ دعوت حق کا راستہ روکیں، یا اللہ کے بندوں پر ظلم کریں یا مسلم حکومت کے خلاف جارحیت کے مرتکب ہوں۔

دراصل ان آیتوں کا مدعا اور ان میں دیے گئے حکم کی اصل نوعیت سمجھنے کے لئے ان کے پس منظر اور ان حالات کو جاننا ضروری ہے جن کے درمیان وہ نازل ہوئیں۔ یہ آیات غزوۂ تبوک کے موقع پر نازل ہوئی ہیں۔ یہ بیزنطینی روم کے خلاف ایک مہم تھی جو سن نو ہجری میں انجام دی گئی، اس وقت ہرقل عظیم رومن سلطنت کے فرماں روائے اعظم قیصر کی حیثیت سے سریرآرائے سلطنت ہو چکا تھا، اور اسی لئے اسلامی مآخذ اس کو کبھی قیصر اور کبھی ہرقل کہتے ہیں۔ رومن حکومت کی کچھ عمل داریاں عرب سرزمین میں حدود شام اور شام کے اندر قائم تھیں۔ شمال عرب میں غسانیوں کی مشہور حکومت تو مستقل طور پر ان کی تابع تھی ہی، اس کے علاوہ اسی علاقہ کی کچھ دیگر قبائلی طاقتیں بھی رومیوں کی عمل داری میں تھیں اور عیسائی ہو چکی تھیں، گویا یہ پورا خطہ رومی سلطنت عظمیٰ کا حصہ تھا۔

رومی سلطنت سے کشمکش کا آغاز ۸ھ میں فتح مکہ سے پہلے ہو چکا تھا۔ روم جیسی توسیع پسند جابر طاقت، کو جس نے

جاگیرداری کے ظالم نظام میں غریب عوام کو جکڑ رکھا تھا، اپنے بالکل پڑوس میں ایک ایسی ابھرتی ہوئی طاقت کیسے برداشت ہوسکتی تھی جو اپنکے جلو میں دلوں کو فتح کرنے والی ایک ایسی دعوت رکھتی تھی جس کا اعلان تھا: ''بادشاہوں کی نہیں، اللہ ہے یہ زمیں'' اور ''اللہ کی بندگی میں داخلہ، بندوں کی غلامی سے آزادی''۔ ابتداء ایسے ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۱۵ر آدمیوں کی ایک جماعت ان علاقوں میں بھیجی انہوں نے وہاں دعوت اسلام دی، مگر ان سب کو ذات اطلاح نامی مقام پر قتل کردیا گیا۔ ان کے امیر حضرت کعب بن عمیر نہایت زخمی حالت میں بچ کر مدینہ واپس آئے اور اس سنگین واقعہ کی اطلاع دی۔ (سیرت ابن اسحاق، البدایہ والنھایۃ)

ابھی یہ زخم تازہ ہی تھا کہ رومی حکومت کی ایک اور جارحیت اور اسلام دشمن حرکت سامنے آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شمال کے ان عرب علاقوں میں مستقل دعوتی مہمیں بھیجی تھیں۔ ان کے نتیجہ میں فروۃ بن عمرو (یا ابن نفاثہ) نامی ایک عرب حاکم نے جو رومیوں کی جانب سے عرب قبائل پر متعین تھا اسلام قبول کرلیا اور رسول اللہ ﷺ کو خیر سگالی کے طور پر کچھ ہدایا بھی بھیجے۔ رومیوں نے اس کو مرکز طلب کیا اور قتل کر کے سولی پر چڑھا دیا۔ (سیرت ابن ہشام)

اسی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمان روایان ممالک کو دعوت اسلام کے خطوط بھیجے تھے، ان میں ایک خط بصریٰ کے حاکم کے نام بھی تھا۔ راستے میں غسانی بادشاہ شرحبیل بن عمرو نے، جو رومی حکومت کا علاقے میں نائب تھا اور عیسائی تھا، آپ کے سفیر حضرت حارث بن عمیر کو پکڑ کر قتل کردیا۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے یہ پورا خطہ رومی سلطنت میں داخل اور عیسائی حکومتوں کے تابع تھا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے ان طاقتوں کی تادیب ضروری سمجھی۔

اب غزوہ موتہ ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا غالبا اندازہ تھا کہ روم کی تابع ان عرب ریاستوں کے لئے ایک مختصر فوج (۳ر ہزار) کافی ہونی چاہئے۔ مگر ادھر براہ راست قیصر (ہرقل) حرکت میں آچکا تھا۔ اسلامی لشکر علاقے میں پہنچا تو پتہ چلا کہ رومی زبردست لشکر کشی کرنے کی تیاری کرچکے ہیں، غسانی عیسائی عرب قبائل کی بڑی تعداد لے کر سامنے ہیں اور ایک بڑی کمک لے کر ہرقل کا بھائی تھیوڈور آرہا ہے۔ خود قیصر روم حمص میں پڑاؤ ڈالے ہے۔ بہرحال اللہ کی نصرت اور مجاہدین کی جانبازیوں کی بدولت لشکر اسلام بحفاظت واپس آگیا، اور رومی مرعوب ہوئے اور ان کو اندرون عرب لشکر کشی کی جرأت نہیں ہوئی۔

اس اثناء میں خود مدینے کے اندر سے ایک فتین شخص ابوعمر وراہب عیسائی ہوکر غسانیوں کے یہاں بھاگ گیا تھا، اور مستقل اس سازش میں مصروف تھا کہ وہاں سے ایک بڑی فوج لے کر مدینہ پر حملہ کرے، مدینہ میں منافقین مستقل اسی کے رابطے میں تھے، آخر جب یہ سازش اپنے عروج کو پہنچی تو انہوں نے عین مدینہ میں مسجد کے نام پر اپنا ایک مستقل مرکز بھی بنالیا جہاں بیرونی حملہ آور افواج کی مدد کے منصوبے تیار ہوتے تھے۔ قرآن نے اسی پوری سازش کا پردہ چاک کیا کہ یہ مرکز دراصل رومی حملہ کی سازشوں کا گڑھ ہے۔ (سورۂ توبہ: ۱۰۷)

اب سن ۹ ہجری آتا ہے۔ رومیوں کی حرکتیں اس درجہ بڑھ گئی تھیں کہ صحابہ کرام کو ہر دم رومی حملے کا اندیشہ لاحق تھا۔ ایلاء

کے سلسلۂ واقعات میں آتا ہے کہ جب حضرت عمر کے ایک پڑوسی نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا اور نہایت بے چینی کیساتھ کہا کہ: ارے! بڑا حادثہ ہوگیا'' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دفعۃً پوچھا: کیا ہوا؟ کیا غسانیوں نے حملہ کردیا؟ خود حضرت عمر بیان کرتے ہیں کہ اس زمانے میں یہ خبریں آرہی تھیں کہ غسانی حملے کی تیاریاں کررہے ہیں (صحیح بخاری)۔

اب تاجروں اور مسافروں نے آآ کر خبریں دیں کہ رومی اپنے حلیف عیسائی عرب قبائل اور ریاستوں کیساتھ مل کر مدینہ پر حملہ کرنے کیلئے تیاریاں کررہے ہیں، فوجوں کو ایک سال کی تنخواہیں پیشگی بانٹی گئی ہیں، اور کچھ دستے بلقاء تک پہنچ رہے ہیں۔ (المواھب اللدنیہ (مع شرح زرقانی) ۳/۶۳، ابن سعد ۲/۱۶۵)۔ روایات بتاتی ہیں کہ عیسائی قبائل نے اپنے آقا قیصر روم کو خط لکھ کر یہ خبر دی کہ عرب میں اس سال شدید قحط ہے، حملہ کرنے کے لئے یہ موقعہ اچھا ہے تو اس نے اپنی طرف سے ایک بڑی فوج تیار کرکے عرب پر لشکر کشی کے لیے بھیجی۔ (المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۸/۲۳۱)۔

یہ وہ حالات تھے جن میں رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک کا فوری حکم دیا اور باوجود اس کے کہ موسم سخت گرم تھا اور مسلمانوں کو سخت غربت اور تنگ حالی کا سامنا تھا، لہذا جنگ کیلئے یہ وقت نہیت مشکل اور نامناسب تھا۔ لیکن کوئی تاخیر اس لئے ممکن نہیں تھی کہ خطرہ نہایت سنگین تھا اور فوری تھا۔ خطرہ اس لیے بھی نہایت سنگین تھا کہ فتح مکہ کے بعد عرب قبائل کا اسلام ایسا مضبوط نہیں ہوا تھا کہ اگر رومی اندرون عرب گھس کر حملہ کرتے تو ان سے استقامت کی امید کی جاتی۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے فوراً بعد ان قبائل کی بڑی تعداد کے ارتداد اور بغاوت نے ثابت کردیا کہ اگر روم جیسی طاقت کا حملہ ہوتا تو یہ قبائل یقیناً بغاوت کردیتے اور اسلامی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجادیتے۔ اس لئے آپ ﷺ نے سرحد پر جاکر ہی دشمن کو روکنا اور مسلمانوں کی قوت کا رعب قائم کرنا ہر حال میں ناگزیر جانا۔

ان حالات میں یہ دونوں آیتیں مسلمانوں کو رومی طاقتوں سے جنگ کیلئے حکم دینے اور اس پر ابھارنے کیلئے نازل ہوئیں

ایک اہم نکتہ جس پر ان آیات کا صحیح فہم موقوف ہے: اس دراز تفصیل کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ یہ واضح کیا جاسکے کہ یہ آیات دراصل اہل کتاب سے جنگ کے فقہی مسئلہ کو بیان کرنے یا ابتداءً اس کا حکم دینے کے لئے نازل نہیں ہوئیں، اہل کتاب سے اور رومی عیسائی طاقتوں سے کشمکش پہلے سے جاری تھی۔ یہ جنگ پہلے سے فرض ہوچکی تھی اب یہ آیات مسلمانوں میں اس جنگ کیلئے ہمت وجوش پیدا کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں اور رومیوں کی یہ صفات کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے دین حق کے منکر ہیں، اور اللہ ورسول کے محرمات کو حرام نہیں سمجھتے، فوجوں کے اندر جوش اور ان کے خلاف غیظ وغضب پیدا کرنے کے لئے بیان کی گئی ہیں۔ یہ رومیوں سے قتال کی علت نہیں ہیں۔ قتال کی علت رومیوں کا صدعن سبیل اللہ (اللہ کے راستے سے روکنا) ایک مسلمان کو اسلام قبول کرنے کی پاداش میں قتل کرنا (فتنہ) اور مسلمانوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں (محاربہ) کرنا تھا۔ بہرحال اس سے پتہ چلتا ہے کہ شمال عرب کی ان ساری مہموں کی اصل علت ''محاربہ'' اور ''فتنہ'' تھی۔ (بقیہ صفحہ نمبر ۵۶ پر)